جدید اردو شاعری میں تصورِ خدا

صائمہ علی

Abstract:

Although God is the only omnipotent power and central source to seek divinity and set beliefs for all religions, even though it has become a social practice in present era to centralize and focus the ideologies and set patterns devised by the nominated personalities of different religions in the long run of spread and preaching of respective religions. Freedom of expression is allowed on legal basis in west; no matters it targets God and religion in this race - but such genre of expressions are highly objectionable rather forbidden in Islam. Anyhow, poetry - a big literary genre - offers a license to talk about power and presence of God. Therefore, certain examples regarding deviations from God and religion. Skepticism in other sense, are found in poetry. Classical poetry presents such concepts symbolically and metaphorically. Whereas, modern poetry talks explicitly about omnipotence of God. The purpose of this research study is to examine and explore the causes and effects of above mentioned phenomenon in modern poetry.

خدا ہر دین کا منبع و مرکز ہے لیکن معاشرتی سطح پر مذہب کی تبلیغ و ترویج کے عمل میں خدا کے وجود سے زیادہ اہمیت دین کے عقاید، شعایر اور نمایندہ شخصیات کو دی گئی۔ مغرب میں آزادی اظہار کی وجہ سے خدا اور مذہب ممنوعہ موضوع نہیں اس کی مقابلے میں اسلام میں عقاید و احکام کی پیروی پر بہت زور ملتا ہے اور اس سے انحراف کو تکفیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہب کے متوازی خدا اور بندے کے تعلق کو انسان کا ذاتی معاملہ تصور کیا جاتا ہے جس کی عکاسی ''با خدا دیوانہ باشی با محمد ہوشیار'' جیسے مصرعوں سے کی جا سکتی ہے چنانچہ توہین رسالت کے معاملے پر عوامی

ردعمل کے مقابلے میں خدا کے متعلق غیر روایتی سوچ کو مذہبی شدت پسندی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ چنانچہ عقائد کا وہ حِصّہ جو صرف خدا سے متعلق ہے، آسانی سے تحریر وتقریر میں بیان کیا جا سکتا ہے مثلاً خدائی، فرشتے، حور، محشر، داور، جنت، دوزخ، گناہ، ثواب، عبادت وغیرہ۔

اس معاملے میں ایک اور تقسیم بھی نظر آتی ہے نثر کی نسبت نظم میں تخیل کی آزادی کی بدولت شاعر اس نوع کے سوالات اٹھانے کی جرأت رکھتا ہے۔ نثر نگار کی نسبت شاعر پر احتساب کا عتاب کم ہوتا ہے۔

ن۔م۔ راشد کے مطابق:

> ''خوش قسمتی سے ہماری شاعری میں مذہب کے میں اظہار خیال کی ایک بیش بہا روایت چلی آ رہی ہے۔ وہی باتیں نثر میں کہنے والے اکثر سولی پر چڑھا دیئے گئے ہیں۔'' (۱)

کلاسیکی اُردو شاعری میں خدا کا ذکر فلسفیانہ، حکیمانہ، ناصحانہ، مؤدب مہذب، طنزیہ، شگفتہ، لطیف ایسی مختلف النوع خصوصیات کے ساتھ ملتا ہے جس میں خدا سے شکایت بھی ہے اور محبت بھی۔ اس کے وجود پر تشکیک بھی ہے اور یقین بھی۔ اس کے حساب کا ڈر بھی ہے اور اس کی رحمت کی امید بھی۔ کہیں وحدت الوجود کے زیر اثر جگ میں ہر جگہ رب کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور کہیں بتوں کو رب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ میر تقی میرؔ کو کہیں خدا کی دی ہوئی مختاری تہمت معلوم ہوتی ہے اور کہیں کہتے ہیں:

میرؔ اُٹھ بت کدے سے کعبے گیا
جس کو چاہے خدا خراب کرے

غالب اگرچہ خدا کو ''یگانہ'' اور ''یکتا'' قرار دیتے ہیں لیکن کبھی جنت کو دل کے بہلانے کا خیال قرار دیتے ہیں اور کبھی اپنے محبوب کے معاملے میں خدا پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ اقبال کے ہاں خدا کے وجود پر کامل یقین کے ساتھ تشکیک کے آثار بھی ملتے ہیں۔ کہیں وہ بے چارے مسلمان کو فقط وعدۂ حور'' سے بہلانے پر شاکی ہیں۔ اور کہیں محشر میں ''دامن یزداں چاک'' کرنے کی فکر میں ہیں بحیثیت مجموعی کلاسیکی شاعری میں خدا کے متعلق تشکیک کے ساتھ ایسا انداز ملتا ہے جس سے خالق اور مخلوق کے درمیان ادب کے تقاضے مجروح نہیں ہوتے۔ اس پس منظر کے باوجود جدید شاعری میں خدا کے متعلق تشکیک اور تکفیر کا اظہار نامناسب لہجے میں ہوا۔

اس انداز کے پیچھے دو بڑے محرکات نظر آتے ہیں۔ اوّل مغربی فکر کے اثرات دوسرے مذہبی شدت پسندی کا ردعمل جن میں زیادہ اثر اول الذکر پہلو کا ہے کیونکہ مذہبی شدت پسندی تو کسی نہ کسی انداز میں ہمیشہ ہمارے معاشرے میں رہی ہے۔ برطانوی قبضے کی وجہ سے ہندوستان میں مغربی فکر وتہذیب کے اثرات تیزی سے پھیلے جہاں آزادی اظہار کی وجہ سے خدا اور مذہب پر آزادانہ بحث ہوتی تھی۔ نطشے کی فکر کے تحت خدا کی موت کا اعلان کیا گیا اور روایت سے بغاوت کو فروغ مِلا۔

برطانوی مصنفہ Karen Armstrong اپنی کتاب History of God میں لکھتی ہیں:

> This was the century (19th) in which Ludwig Feuerbach, Karl Marx, Charles Darwin, Friedrich Neitzsche and Sigmund Freud forged Philosophies and scientific interruption of reality which had no place for God. Indeed by the end of the century a significant number of people were begining to feel that if God was not yet dead, it was the duty of national emancipated human being to kill him."(2)

ہندوستان میں ان مغربی لادینی نظریات کی ترویج میں دوسرے عوامل کے ساتھ ترقی پسند تحریک نے بھی اہم کردار ادا کیا جس کے تحت اس کا اولین اظہار ''انگارے'' کی اشاعت سے ہُوا جس پر مذہبی طبقے کی طرف سے شدید ردِعمل سامنے آیا۔ اس پس منظر میں شاعری میں بھی خدا اور مذہب کے متعلق اعتقادات کو ٹھیس لگانے کا رُجحان نمایاں ہوا۔ ڈاکٹر حنیف فوق اس تاثر کو درست نہیں مانتے۔ ان کے مطابق:

> ''جہاں تک مذہب کی تضحیک اور ترقی پسندی کا تعلق ہے ترقی پسند ادیبوں نے کوئی ایسی نئی بات نہیں کہی جسے قدما نہ کہہ چکے ہوں۔ اگر اقبال ''خداوندا خدائی دردِسر ہے۔'' کہہ سکتا ہے تو اسکی توضیح کرے پر ترقی پسند ادیب کیوں ہدفِ ملامت بنایا جائے۔ واعظ، شیخ، قاضی، ناصح، محتسب، آئمہ دین، رسول یہاں تک کہ خدا کے ساتھ جو تمسخر قدیم شعرا نے روا رکھا ہے، اس سے آگے بڑھنا نہ جائز ہے نہ ممکن! اگر غالب اپنے معشوق کو اس ڈر سے خدا کے حوالے نہیں کرتے کہ کہیں بقول جوش اُن کی غیبت میں ''اونچ نیچ'' نہ ہو جائے تو اقبال بھی کبھی شیطان کو رُومانی ہیرو بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹک جائے۔''(۳)

ڈاکٹر حنیف فوق کے خیالات کے باوصف ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے زیرِاثر دنیا میں غربت، نا انصافی، ظلم، استحصال پر خدا کو الزام دیا گیا۔ کمیونزم کے جھنڈے تلے خدا اور مذہب کو اضافی قرار دیا گیا۔ کلاسیکی شعراء کے برعکس جدید شاعری میں خدا کے متعلق ایسا انداز اختیار کیا گیا جو دین کی بنیادی تعلیمات کے خلاف تھا مثلاً خدا کی الوہیت کی نفی کرنا اس سے انسانی اعمال وابستہ کرنا وغیرہ، اس رجحان کی عکاسی ان اشعار سے ہوتی ہے:

ے ہے واقعی منتقم تو کھوٹا ہے خدا
سونا جس میں نہیں ہے وہ گوٹا ہے خدا

؎ شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ
شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا
(جوشؔ)

جوہر قوت سے جوہروں سے ذرات
ذروں سے یہ سیال جمادات، نباتات
حیوان اور اس کے آگے انسان بس
کیا ٹوٹ گئے صانع تقدیر کے ہاتھ
(اجتبیٰ رضوی)

؎ فگار پاوں میرے، اشک نارسا میرے
کہیں تو مل مجھے اے گمشدہ خدا میرے
(مصطفیٰ زیدی)

؎ جو مجھ میں چھپا میرا گلا گھونٹ رہا ہے
یا وہ کوئی ابلیس ہے یا میرا خدا ہے
(فہمیدہ ریاض)

؎ دیکھ اب اپنے ہیولے کو فنا ہوتے ہوئے
تو نے بندوں سے لڑائی کی خدا ہوتے ہوئے
(شہزاد احمد)

؎ مدت سے خدا بھی نہیں آیا مرے دل میں
بچوں کی طرح بھول گیا راستہ گھر کا
(سلیم احمد)

؎ خدا کے پاوں کے نیچے سے ریت لوٹ رہی
سبک ہوا ہے کسی لہر میں اُچھال اُسے
(ساقی فاروقی)

؎ دعا کے ہاتھ پتھر ہو گئے ہیں
خدا ہر ذہن میں ٹوٹا پڑا ہے
(ندا فاضلی)

بپا زمیں پہ ہے اجلاس مور بے مایہ
رئیس وقت تماشائی ہے خدا کی طرح
(محسن احسان)

؎ یا الٰہی تو اگر ہے تو ہویدا ہو جا
اور نہیں ہے تو ابھی وقت ہے پیدا ہو جا

(شجاع خاور)

اس نوعیت کے بیشتر اشعار میں خدا کے متعلق اپنائے گئے۔ نازیبا لہجے کی کوئی ٹھوس وجہ نظر نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی فیشن کے تحت خدا کے وجود کی تکفیر، تردید اور تضحیک کی جا رہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اس رجحان کے متعلق لکھتے ہیں:

''انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انہیں خدا سے کیوں بیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو ایک ایسے کیمیائی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے...... الحاد کی گرم بازاری ہمارے ہاں صحیح فکری شاعری کی کمی کا نتیجہ ہے۔''(۴)

اگرچہ خود قاسمی کے ہاں خدا کے متعلق بے باک رویہ پایا جاتا ہے لیکن اس کے پیچھے کوئی منطقی وجہ بہرحال ہوتی ہے۔ یہ رویہ بہت سے شعرا کے ہاں پایا جاتا ہے کہ خدا کے خلاف شکایت کسی ٹھوس وجہ سے کی جائے۔ جس میں بڑی وجہ دنیا کے ظلم وستم پر خدا کا خاموش رہنا، عرش نشین ہونا، اہل زمین کے مسائل سے بے نیاز ہونا، امیر کی آسائشیں اور غریب کی مصیبتیں شاعروں کو خدا سے شکوہ کناں کرتی ہیں۔

؎ اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

(احمد ندیم قاسمی)

؎ دھرتی پہ ہو رہے ہیں ستم تیرے نام پر
اے رب ذوالجلال تو تسلیم کر نہ کر

(تنویر سپرا)

؎ کب سے افلاس کے تلاطم میں
خس کی مانند بہ رہا ہوں میں
؎ اس کے باوصف میری ہمت دیکھ
تجھ کو رزّاق کہہ رہا ہوں میں

(نسیم لیہ)

؎ آج کے دن بھی مرا رزق نہ مجھ پر اُترا
آج کے دن بھی پڑوسی مرے رازق ٹھہرے
(اقبال ساجد)

؎ ذرا سی کشتیِ دل کو بھی وہ بچا نہ سکا
میں کیا کہوں کہ خدا کیا ہے، ناخدا کیا ہے
(جمیل ملک)

کلاسیکی شاعری میں خدا کے وجود کے متعلق تشکیک ملتی ہے لیکن یہ موضوع علامتی اور اشاراتی انداز میں ملتا ہے جبکہ شاعری میں علامتی کے بجائے براہ راست اظہار سے یہ تشکیک خدا کے وجود پر سوال اٹھاتی ہے۔ خدا کو سمجھنا ایک فطری خواہش ہے۔ اُس کی غیبت اس جستجو کو بڑھاتی ہے لیکن انسانی حواس اور ذہن کے ذریعے خدا کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لیے فلسفیوں اور شعرا کے ہاں یہ فکر ملتی ہے کہ جو سمجھ میں آ جائے وہ خدا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ انسانی عقل سے ماورا ہے۔ یہ فکر مغرب میں بھی ملتی ہے۔ Joseph Runzo لکھتے ہیں:

"God's revelation is not directly accessible to the human mind and that we can never know, even when God will also make sense if one assumes that we can never know, even when God does reveal Godself, that God has done so."(5)

؎ جس کو جانا ہی نہیں اس کو خدا کیوں مانیں
اور جسے جان چکے ہیں وہ خدا کیسے ہو
(شہزاد احمد)

عجیب بات ہے لب پر مرے دُعا بھی ہے
مگر میں سوچ رہا ہوں کہیں خدا بھی ہے
(خواجہ محمد زکریا)

؎ مدرکہ! دوسرے لوگوں کا کہا کیوں مانوں
سب خدا کہتے ہیں جس کو تجھے کیا لگتا ہے
(مراتب اختر)

؎ وہ خدا ہے تو مری روح میں آواز کرے
کیوں پریشان کرے دور کا سننے والا
(ساقی فاروقی)

؎ مرے خدا مجھے اس آگ سے نکال کہ تُو
سمجھ میں آتا ہے ایقان میں نہیں آتا
(عرفان صدیقی)

؎ جو ابتدا بھی نہیں جس کی انتہا بھی نہیں
اگر وہ کچھ بھی نہیں ہے تو کیا خدا بھی نہیں
(تحسین فراقی)

؎ گرجا کی گھنٹیوں نے مری نیند تک اُڑائی
تو ہے کہاں کہ تیری صدا آج تک نہ آئی
(صابر ظفر)

؎ دکھائی دیتا تو تشکیک کیوں جنم لیتی
یقین ہوتا ہمیں تو گمان کیا کرتے
(منصور آفاق)

خدا کے متعلق اشعار میں بالواسطہ شکایت کا انداز بھی ملتا ہے جہاں طنز کے پیرائے میں خدا کی ذات کا شکوہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ شکایت کا نسبتاً مہذب طریقہ ہے جہاں براہ راست خدا پر تنقید کے بجائے طنز لطیف کے پیرائے میں اپنی شکایت بیان کی جاتی ہے۔ اس انداز میں موضوع کے ساتھ شعری سطح بھی بلند ہوتی ہے مثلاً:

؎ صدمے دیئے تو صبر کی دولت بھی دے گا وہ
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں
(یگانہ)

؎ اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
(فیض)

؎ اس کی رحمت کا کیا حساب کریں
اک ہمیں سے حساب کرتی نہیں
(احمد فراز)

؎ ترا کرم ہے کو تو نے مجھے عطا کر دی
وہ زندگی جو کسی اور نے نہ چاہی تھی
(شہزاد احمد)

؎ میں اُس کو یاد دلاؤں گا ایک دن جا کر
بنا کے بھول گیا ہے اگر خدا دنیا
(ظفر اقبال)

؎ آسمانوں میں وہ مصروف بہت ہے شاید
بانجھ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے
(پروین شاکر)

؎ آنکھوں میں روشنی کی جگہ تھا خدا کا نام
پاؤں تڑا کے مر رہے جاتے کہاں جناب
(شمس الرحمان فاروقی)

کس لیے سر کو جھکائیں اجنبی کے سامنے
اس سے ہم واقف تو ہیں اپنا خدا جیسا بھی ہے
(افتخار نسیم)

وہ مہربان ہے گاؤں کے سادہ لوحوں پر
قلیل رزق میں عمریں طویل دیتا ہے
(اکبر حمیدی)

؎ شہناز ہم نے ایسے گزاری ہے زندگی
دنیا میں جیسے کوئی ہمارا خدا نہ تھا
(شہناز مزمل)

؎ نہ تعلق نہ واسطہ جیسے
وہ ملا یوں کہ خدا ہو جیسے
(محسن احسان)

؎ ہم اُسے بھول گئے تو بھی نہ پوچھا اس نے
ہم سے کافر سے بھی جزیہ نہیں مانگا اپنا
(ساقی فاروقی)

؎ خیر اس بات پر لازم ہی سہی سجدہ سہو
ہم نہ بھولے تھے مگر ہم کو خدا بھول گیا
(عزیز حامد مدنی)

دنیا کے ہر مذہب میں خدا کی رحمت کا تصور مشترک ہے۔ مُسلم عقائد کے مطابق خدا ستر ماؤں سے زیادہ

مہربان ہے جو شرک کے علاوہ ہر گناہ معاف کرسکتا ہے، شرط خلوصِ دل سے اُسے پکارنا ہے۔ رحمان، رحیم، کریم، توّاب، ستّار، غفور، غفار، غفران جیسے نام اس کی بے پایاں رحمت اور بخشش کا پتہ دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ موت کے بعد انسان کی بے بسی، فشارِ قبر، منکر نکیر کی پُرسش، میدانِ حشر، اعمال نامہ، حساب کتاب، داورِ محشر، جہنم کا شدید عذاب ایسی چیزیں ہیں جو شعرا کے تصوّرِ خدا میں متضاد صورت پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ کبھی شاعر اس عذاب کو مُلا کا فساد اور کبھی خدا کی رحمت پر سوالیہ نشان قرار دیتے ہیں۔ محشر کا تصور شعراء کے ہاں مختلف کیفیات کے ساتھ آیا ہے مثلاً:

ے تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں
اے خدا، میرے خدا، تجھ کو خدا سمجھا تھا میں

(پنڈت ہری چند اختر)

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

(مُلاّ آنند نرائن)

ے تو کیا وہ ہم کو ہر اک جرم کی سزا دے گا
پھر اپنے رحم و کرم کا ثبوت کیا دے گا
میں روزِ حشر کا قائل ہوں پھر بھی ہنستا ہوں
کہ ایک بندہ خدا کو جواب کیا دے گا

(جمیل الدین عالی)

یہ پُرسش یہ پاداش کیوں کس خطا میں
بتا تیری دنیا سے کیا لے کے بھاگے

(شان الحق حقی)

تو بھی مجھے خدا کی طرح حشر پہ نہ ٹال
میری عبادتوں کا یہیں پر ثواب دے

(تنویر سپرا)

نیکیوں کا اجر کوئی ہے تو کاش
آج ہی مل جائے محشر میں نہیں

(انور شعور)

اس طنزیہ لہجے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شاعر یہ باور کرنے کو تیار نہیں کہ وہ خدائے رحیم و کریم اپنے بندوں کو آتش جہنم میں جلتا دیکھے گا وہ مخلوق کے لیے خالق کے کرم سے پیش نظر عذاب کو مُلا کی لن ترانی قرار دیتا ہے۔ خدا کے عذاب کی وعید اور رحمت کی نوید کے متضاد موضوع پر باب العلم حضرت علی علیہ السلام ''دعائے کُمیل'' میں لکھتے ہیں:

''اے میرے رب یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ وہ تو رہائی کے بارے میں تیرے فضل کی اُمید رکھتا ہو اور تو اُسے اسی میں پڑا رہنے دے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ نہ تیری نسبت یہ گمان ہے اور نہ تیرے کرم ہی سے ایسی کسی کو یہ صورت پیش آئی اور نہ اپنی نیکی و احسان کے باعث تو نے اہلِ توحید کے ساتھ کبھی اس طرح کا معاملہ کیا۔ پس میں تو یقین کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر تو نے اپنے منکروں کو عذاب دینے کا حکم نہ لگا دیا ہوتا اور اپنے مخالف کو آتشِ جہنم میں دوامی سزا دینے کا فیصلہ نہ فرما دیا ہوتا تو آتش جہنم کو بالکل سرد فرما دیتا اور وہ بھی اس طرح کہ سلامتی ہی سلامتی رہتی اور کسی ایک کا بھی اس میں مقام اور جائے قیام مقرر نہ فرماتا۔''(۶)

اس موضوع پر شعرا نے مختلف پیرایوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

ے موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

جدید شعرا بھی اس معاملے میں خدا کی رحمت اور مغفرت کو پیش نظر رکھتے ہیں:

ے جہنم سرد ہے جنت کے در کھلوائے جاتے ہیں
گنہ گارانِ اُلفت پیشِ داور لائے جاتے ہیں
(جوش)

ے سمجھ کے اس کو غفور الرحیم پیتا ہوں
نہ چھیڑ ذکر عذاب و ثواب رہنے دے
(اختر شیرانی)

خالی پڑی رہیں گی جہنم کی وسعتیں
یاد آئے گی نہ حُسن کرم کو حساب کی
(احمد ندیم قاسمی)

کوئی نیکی نہیں شہزاؔد مرے دامن میں
اس کا باوصف بھی رحمت کا طلبگار ہوں میں
(شہزاد احمد)

ے رحمت نے گنہ گاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا
واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے
(نجم آفندی)

دُعا بندے اور رب کے درمیان تعلق کا مضبوط ہے اور حسین رشتہ ہے جو بندے کو خدا سے ہم کلام کر دیتا ہے۔ دُعا انسانی فطرت بھی ہے اور حکم خدا بھی۔ سورہ مومن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''وقال ربکم ادعونی''

ترجمہ: اور تمہارا رب کہتا ہے کہ مجھے پکارو۔

اس کے باوجود زہد وتقوی اور ایمان کے انتہائی سروں پر یہ تصور بھی ملتا ہے کہ دُعا وہ کرے جس کو خدا پر کامل یقین نہ ہو۔ وہ خدا جو دلوں کے بھید جان لیتا ہے وہ مانگے بغیر ہماری دعاؤں سے واقف ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا:

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مُدعا نہ مانگ

اقبالؔ کہتے ہیں:

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے غرض جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

جدید شاعری میں ایمان وعرفان کی یہ منزل کم ملتی ہے کہ دُعا خامیٔ ایمان کا سبب بن جائے یہ رُجحان ہے لیکن کم۔

دُعا بھی ہے مرے مشرب میں خامیٔ ایماں
جو بے نیاز کا بندہ ہے بے نیاز رہے

(احسان دانش)

کہیں عاجزی سے گریز کا مشورہ بھی ہے جسے غالب نے محبوب کے سلسلے میں آزمایا تھا۔ قاسمی دُعا میں آزما رہے ہیں:

عجز اچھا ہے مگر اس کی بھی حد ہوتی ہے
تم دُعا رُوٹھ کے مانگو تو اثر دور نہیں

(احمد ندیم قاسمی)

جدید شعرا کے ہاں غالب رُجحان دعاؤں کی عدم قبولیت پر مایوسی اور نا اُمیدی کا ہے یہ مایوسی بطور قوم ہمارے دگرگوں سیاسی حالات، ترقی معکوس، تہذیبی زوال اور اخلاقی زبوں حالی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ جو عوامی مزاج کے ساتھ شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ ہمارے شعرا اس سلسلے میں رجائی فکر، تعمیری سوچ، قوت عمل کے بجائے اضمحلالی اور انفعالی رویہ کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال میں خود احتسابی کے بجائے خدا سے نا اُمیدی کا اظہار کرتے ہیں جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا:

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نامیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

جدید شعراء میں اس رجحان کے اشعار دیکھئے:

؎ اتنا مایوس نہ ہو اپنے خدا سے کوئی
ہاتھ اُٹھے رہ گئے اور ہم سے دُعا بھی نہ ہوئی
(کیفی اعظمی)

؎ بندے کا اور خدا کا تعلق ہی مٹ چکا
پتھر ہوئی زبان، مناجات کیسے ہو
(شہزاد احمد)

؎ جو مری ریاضت نیم شب کو سلیم صبح نہ مل سکی
تو پھر اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ یہاں خدا کوئی اور ہے
(سلیم کوثر)

؎ سب دعائیں عرش سے ٹکرا کے واپس آ گئیں
آسمانوں کی طرف اب عمر بھر دیکھے گا کون
(محسن احسان)

؎ ہمارے حال پہ رونے سے فائدہ تو نہیں
خدا کی سمت دریچہ کوئی کُھلا تو نہیں
(محمد اظہار الحق)

دوسری اصناف کی نسبت غزل میں حقیقی سے زیادہ مجازی فضا ملتی ہے۔ چنانچہ دیگر موضوعات کی طرح خدا اور مذہب کے متعلق شعرا کے خیالات سو فیصد حقیقی معانی نہیں رکھتے۔ ان پر غزل کے مزاج کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اس کے متعلق لکھتے ہیں ''یہ سب زیادہ تر غزل گوئی کی وضع داری اور مذہب عشق کی فرماں برداری میں کیا گیا اس کو حقیقت حال سے زیادہ تعلق نہ تھا اور دوسرے یہ کہ ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ یعنی غزل وقصیدہ میں شعرا کے اقوال کا مفہوم وہی نہیں تھا جو نظم ہوا۔'' (۷) غزل میں الحادی فکر کی نوعیت اس شعر سے واضح ہوتی ہے:

؎ مسلسل ایک آہنگ ندیماں ہو کے آیا ہے
غزل میں کفر آیا ہے تو ایماں ہو کے آیا ہے
(داؤد رہبر)

غزل کی نسبت نظم خصوصاً آزاد نظم میں تصور خدا سے انحراف کو زیادہ بے باک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس رجحان کی ابتدا ن ۔م راشد سے ہوتی ہے۔ راشد نے مذہبی اعتقادات پر کاری ضرب لگائی وہ خدا کے ساتھ شدید اختلاف رکھتے ہیں جو نظریاتی نوعیت کا ہے۔ اس کی بڑی وجہ خدا کی مغرب نوازی اور مشرق فراموشی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ذرا اس دریچے سے باہر تو دیکھو

خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے
اُسی ساحر بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے
(پہلی کرن)

اس کے علاوہ بھی راشد کے ہاں خدا سے مختلف معاملات پر اختلاف ملتا ہے۔ جس میں اُس کا قوی، عادل اور منصف نہ ہونا، انسان کو مجبور محض بنانا جیسے عوامل شامل ہیں۔ مثلاً

؎ بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تُو نے
اور انسانوں سے لے لی جرات تدبیر بھی تو نے
(مکافات عمل)

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میری خداوند کی تھی
(گناہ)

کسی سے یہ دور یہ اندوہ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاج درد انسان ہو نہیں سکتا
(انسان)

خدا کے ساتھ راشد کا اختلاف مذہبی نہیں سیاسی نوعیت کا ہے ''یہ نہیں کہ راشد خدا کے وجود کے منکر ہیں انہوں نے اپنی بہت سی نظموں میں مغرب کے خدا کے وجود کو تسلیم اور مشرق کے خدا کے وجود کا انکار کر کے دراصل خدا کی ناانصافی کو نشانۂ طنز بنایا ہے۔''(۸)

راشد نے آزاد نظم کی ابتدا میں خدا کے روایتی تصور سے انحراف کی جو صورت پیدا کی ۔ ان کے پیش رووَں میں بھی اس کے اثرات دیکھنے میں آئے۔ مثلاً زاہد ڈار کہتے ہیں:

لیکن جو ٹھیک پوچھو
یا رو تو آسمان پر
کوئی خدا نہیں ہے
سارے خدا یہیں ہیں
تیرا خدا جدا ہے
میرا خدا جدا ہے
میرے لیے تو یارو
لڑکی کا خوب صورت

ننگا بدن خدا ہے

(لفظوں کا سلسلہ)

اس نظم میں خدا کا تصور بیان کرنے کے لیے جو تمثیل بیان کی گئی ہے وہ اس لیے بھی نازیبا ہے کہ خدا جسمانیت سے مُبّرا ہے۔ اُس کی تنزیہہ کو اس سطح سے پہچاننا مناسب نہیں۔ اس انداز کے متعلق **سلیم احمد** لکھتے ہیں:

> ''ممکن ہے یہ مصرعہ بعض لوگوں کو چونکانے یا جھنجھلانے کے لیے اچھا ہو لیکن مصرعے کی سطحیت بتاتی ہے کہ عورت کے بدن کے ''خدا'' ہونے کا تجربہ شخص مذکور کو نہیں ہوا۔ عورت کا بدن تو بڑی چیز ہے۔ ماننے والوں نے تو کنکر اور پتھر کو خدا بنا لیا اور عورت کا بدن جو تقدس رکھتا ہے اس کے خوب اور ننگا ہونے کی شرط بھی کچھ فالتو ہی معلوم ہوتی ہے، پَر میرے یار نے ''میرے لیے تو یارو'' اس طرح کہا ہے جیسے اپنے خدا کو دکھانے کے لیے ڈگڈگی بجائی ہو۔''(۹)

اس کے علاوہ خدا کے تصور سے انحراف کی وجہ دنیا میں بڑھتا ہوا ظلم و ستم بھی ہے جس پر خدا خاموش رہتا ہے۔ یہ تلخ انداز ہندوستان کے شاعروں میں پاکستانی شعراء کی نسبت زیادہ ہے جس کی ایک وجہ تو وہاں مسلمانوں کی معاشرتی پس ماندگی اور مسلم کش فسادات ہیں۔ دوسری وجہ وہاں کی سیکولر فضا ہے جہاں انسان بلا خوف و خطر اپنی سوچ کی عکاسی کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں محمد علوی کی نظم دیکھیے:

تڑا مڑا ہے مگر خدا ہے
اسے تو صاحب سنبھال رکھیے
نہ مسجدوں میں نہ مندروں میں
خدا کہاں ہے کدھر گیا ہے
چلو مرے ساتھ میں بتاؤں
مگر سمے اب گزر گیا ہے
جلائے ہیں ہم نے اُن گھروں میں
خدا بھی جل بجھ کے مر گیا ہے (خدا کہاں ہے)

اسی موضوع کو بشیر بدر نے غزل میں یوں بیان کیا ہے:

؎ میرا خدا بھی جل گیا ان جھگیوں کے ساتھ
مسجد کہاں گری، ترا بھگوان مر گیا

کلاسیکی شاعری میں تصور خدا سے انحراف کو براہ راست بیان کے بجائے علامتی، استعارتی، طنزیہ، شگفتہ اور لطیف انداز میں بیان کیا جاتا تھا جو مشرقی روایات سے مناسبت رکھتا تھا اس کے مقابلے میں جدید شاعری میں اس انحراف

کے بیان کے لیے بلاواسطہ بے باک، جارحانہ اور تلخ انداز سے کام لیا جا رہا ہے۔ جو موجودہ دور کی مادیت پسندی، اخلاقی پس ماندگی ظلم، جبر اور تلخی کو ظاہر کرتا ہے۔

جبر و قدر کا عقیدہ تصوف کے ساتھ شاعری کا بھی موضوع رہا ہے جس میں انسان کو مجبورِ محض اور تقدیر کے تابع قرار دیا جاتا ہے۔ میرؔ کے اس مشہور شعر میں اس طرف اشارہ ملتا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

جبکہ اسی عقیدے کا اظہار اس شعر میں یوں ملتا ہے:

روزِ روشن بھی ترا، لوح سیہ بھی تیری
پر تو یا رب مری روداد گنہ بھی تیری

(احمد فراز)

میرؔ کے شعر میں انسان کے ہر کام کو خدا کی کرنی کہہ کر انسانی اعمال کے متعلق تعمیم پیدا کی گئی تھی جبکہ فراز نے براہ راست انسان کے گناہوں کا ذمہ دار خدا کو قرار دیا ہے۔

عام مشاہدہ یہ ہے کہ کسی معاملے پر انسان کا نقطۂ نظر اس کی سوچ کی سمت متعین کرتا ہے۔ حضرت علیؓ کا مشہور قول ہے ''میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے رب کو پہچانا'' یعنی کوئی طاقت ہے جو ہمارے ارادے کو پورا نہیں ہونی دیتی۔ اس کا مطلب ہے خدا موجود ہے۔ دوسری طرف بہت سے لوگ خدا کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ غالبؔ نے کہا تھا:

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

دوسری طرف خدا کی دی ہوئی زندگی کے متعلق نقطۂ نظر دیکھیے:

زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

(فرازؔ)

حسن عسکری کے مطابق:

''نئی شاعری میں الحاد دیکھنا بھی آپ کی آنکھوں کا دھوکا ہے۔ آزاد خیالی کے لیے خدا سے انکار اب اتنا ضروری نہیں رہا جتنا دس سال پہلے تھا۔ خدا کے متعلق اپنے عقیدے کا اعلان کرنے کا مطالبہ تو صرف اس وقت مناسب ہے جب نئے شاعر الٰہیات پر کوئی کتاب لِکھ رہے ہوں۔ نئے لکھنے والوں میں زیادہ تر لوگ انکار اقرار

کے مسئلے کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔'' (۱۰)

اسی قسم کے خیالات کا اظہار صفدر میر یوں کرتے ہیں:

> ''سزا و جزا کے مفہوم انسانوں کے ذہنوں سے ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے ہی مٹ چکے تھے۔ یہی مادی دنیا اور اس کے گرد یہ خلائیں حقیقت ہیں۔ فرشتے اور حیات اور روحیں اور دوزخ اور شیطان اور رحمان محض لفظ ہیں۔'' (۱۱)

ہر دو شخصیات کے خیالات معروضی نوعیت کے نہیں، آج کے شعرا کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خدا کا ''اقرار و انکار'' اور ''سزا و جزا'' غیر اہم نہیں۔ اس کی وجہ مسلم زوال ہو یا آج کا پیمبری وقت آج کے شاعر کو خدا ضرور یاد آتا ہے۔ چاہے وہ اس سے مایوس ہو، چاہے اس کے عدل کی دہائی دے چاہے اس کی بے نیازی کا گلہ کرے لیکن ان سب صورتوں میں وہ خدا کے وجود کا اقرار کر رہا ہوتا ہے۔ شاعری میں الحاد کی نوعیت وہ نہیں جو لُغت میں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کے مطابق:

> ''شاعری لفظوں کے لغوی معنوں سے نہیں ان معنوں سے پیدا ہوتی ہے جو اپنے تلازمات سمیت شعری روایت میں تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ ذرا اس مزاج کو پہچاننے کی کوشش کیجیے جو اِن اشعار کے پردے میں بول رہا ہے۔ کفر زاہدیت کا جواب ہے اس لیے کہ اس کی کھلی فضا میں شاعر کی آزاد روح اپنے آپ کو پاتی ہے۔'' (۱۲)

حقانی القاسمی شاعری میں الحادی فکر کی کیفیت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ اشعار شاعر کی داخلیت سے زیادہ خارجیت کا اظہار ہیں۔ یہ مذہب کی روح نہیں رسومات کے خلاف جذباتی تخلیقی ردعمل ہیں۔ شخصی خدا کے بندگان خانہ زاد کی پیداوار دین کے خلاف اپنے غصے کا اظہار ہیں۔ مذہب اور اس کے متعلقات کی مسخ شدہ شکلوں کے خلاف یہ تخلیقی احتجاج ہیں۔ (۱۳)

لیکن اس نوعیت کی شاعری پر عوامی ردعمل اسے کفر سے ہی تعبیر کرتا ہے کسی شاعر کے شعری خیالات اور اس کے مذہبی خیالات دو مختلف چیزیں ہیں لیکن عام طور پر قارئین اور نقاد انہیں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی رائے دیکھیے:

> ''مذہب کے ساتھ اخلاقیات سے گریز ہی ان شعرا کا شیوۂ خاص ہے۔ بے گناہی پر شکر ادا کرنے کے بجائے پشیمانی کا احساس ہونا اور یہ کہنا ''گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے'' اسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے۔ اسے بغاوت بھی نہیں کہا جا سکتا۔

کیونکہ مذہب سے بغاوت تو اسے زیب دیتی ہے جس نے مذہب کا مطالعہ کیا ہو جبکہ راشد ہوں یا اس تحریک کے دوسرے شعراء اُن کا مذہبی علم نہ ہونے کے برابر ہے۔(۱۴) لہٰذا ان خیالات کو ان حضرات کی ذہنی پراگندگی کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"(۱۵)

جدید اُردو شاعری میں تصورِ خدا سے انحراف کے متوازی اس کی رحمت کا یقین حیران کن بھی ہے اور خوش کن بھی۔ موجودہ دور کے حالات کی وجہ سے جدید شاعری میں یقین حق اور دعائیہ رنگ پہلے کی نسبت زیادہ ہے خصوصاً ان شعراء میں جن کے ہاں تشکیک بھی ہے، یہ رجحان خوش آئند معلوم ہوتا ہے مثلاً

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی
(جوش)

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
(احمد ندیم قاسمی)

وہ کرم کرتا ہی رہتا ہے گنہ گاروں پر
حل بھی دیتا ہے اگر کوئی پریشانی دے
(شہزاد احمد)

جس نے عرفان کی قندیل جلائی دل میں
شک نہ کرنے کا حوالہ اُسی رب سے آئے
(ساقی فاروقی)

توبہ کی پھر ہم نے جب آیا فرشتہ موت کا
بخش دے گا بخشنے والا کہ وہ توّاب ہے
(داؤد رہبر)

میں سرکشیدہ، عقائد دریدہ ہوں لیکن
مرے خدا مرا سب کچھ تری پناہ میں ہے
(محسن احسان)

انسانی نفسیات ہے کہ شکوے کے پیچھے کہیں نہ کہیں محبت یا تعلق ضرور ہوتا ہے۔ شعرا کے ہاں خدا سے شکوے کی ایک وجہ اس کی محبت، قربت اور اپنائیت بھی ہے۔ انسان خاص حالات میں خدا کو بہت قریب محسوس کرتا ہے۔ یہ قربت اور محبت بھی کبھی شکوے کا باعث بنتی ہے۔ مثلاً

؎ تو نے کیوں مرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا
(ناصر کاظمی)

؎ تجھے میں اپنا تو جانوں مگر گلہ نہ کروں
یہ التزام عجب ہے تری خدائی کا
(یاسمین حمید)

جدید شاعری میں تشکیک اور الحاد کی ایک وجہ انسان کا عرفان اور آ گہی بھی ہے۔ جو اُسے خدا کے تصور کے متعلق کوئی غیر منطقی، غیر فطری بات قبول نہیں کرنے دیتا۔ اسی لیے وہ اسے خدا سے جدا تصور کرتا ہے۔

محمد تقی عابدی کے مطابق:

''عہدِ جدید کو اخلاقی قدروں کا پہلے کے معاشرے کی بہ نسبت زیادہ شعور ہے۔ اس لیے وہ مذہب اور خدا کے اس تصور سے بغاوت کر بیٹھا جو قدیم مذاہب نے دیا تھا یا یوں کہہ لیجیے جو قدیم مذاہب کے انجماد کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔''(۱۶)

ڈاکٹر سعد اللہ کلیم اس رجحان کے متعلق لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے موثر فی الحیات ہونے کا یقین اس حد تک ملتا ہے کہ غزل میں ایک طرح کا گلہ مندانہ لہجہ بھی اُبھر آتا ہے۔ گِلہ کرنے کا عمل انسانیت کے احساس اور موثر ہونے کے شعور کے بغیر ممکن نہیں۔''(۱۷)

جدید شعراء کے ہاں یہ وسیع الخیالی، بلند نظری، رجائیت انہیں خدا کے متعلق جلالی اعتقادات سے دور کرتی ہے۔ خدا کی رحمت کا یقین ہی آگے بڑھ کر بہت سے شعرا کے ہاں تصور انسان کی مُثبت فکر کو فروغ دیتا ہے۔ جو بعض اوقات اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ انسان کا درجہ بڑھتے بڑھتے خدا کے برابر یا کہیں اس سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ میؔر نے کہا تھا:

؎ کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

اقبالؔ کہتے ہیں:

؎ متاعِ بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لُوں شانِ خداوندی

لیکن اس کے پیچھے الحاد نہیں بلکہ عظمتِ آدم ہے جو بالواسطہ خالق کی عظمت پر دال ہے:

؎ گو قباحت ہے بڑی کافر یزداں ہونا
اس سے بدتر ہے مگر کافر انساں ہونا
(جوش)

؎ اب اس کو کفر مانیں یا بلندئ نظر مانیں
خدائے دو جہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں
(فراق)

؎ یزداں پہ جھپٹ پڑے گا شیطاں
انساں ہٹا جو درمیاں سے
(احمد ندیم قاسمی)

جدید شاعری میں تصور خدا کے اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعراء مذہب کی مسخ شدہ صورت اور خدا کے شخصی تصور کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جو حقیقی معنوں میں خدا کی ذات کے خلاف نہیں ہوتا۔ جدید شاعری میں تصور خدا سے انحراف کے متوازی خدا سے اُمید اور یقین کا گہرا رنگ بھی ملتا ہے جو خوش آئند رُجحان ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

(۱) ن۔م۔راشد، لا =انسان، لاہور: المثال، ۱۹۷۹،ص ۲۴

(2) ***Karen Armstrong, History of God***, New York: Brilliantine books, 1993, page 346.

(۳) حنیف فوق، ڈاکٹر، مضمون ''اردو ادب میں ترقی پسند تحریک''، مشمولہ مثبت قدریں، ڈھاکا: دبستان مشرق، ۱۹۶۸ء، ص ۲۵۲

(۴) احمد ندیم قاسمی، دیباچہ جلال و جمال، لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۴ء، ص ۳۰

(5) Joseph Runzo, ***World views and perceiving God***, London: The Macmillan Press Ltd., 1993, page 105.

(۶) دعائے کمیل، سرگودھا، مکتبہ محمدیہ، س۔ن، ص ۴۰-۴۱

(۷) اعجاز حسین، ڈاکٹر، مذہب و شاعری، کراچی: اردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۵۵ء، ص ۲۳۳

(۸) وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، لاہور: ادبی دنیا، س۔ن، ص ۶۸

(۹) سلیم احمد، مضمون ''جدید غزل'' مشمولہ سر سیدین پاکستانی ادب، تنقید، پانچویں جلد، مرتبہ؛ رشید امجد فاروق علی، راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۸۲ء، ص ۹۴۱

(۱۰) حسن عسکری، مضمون ''جدید شاعری مشمولہ مجموعہ حسن عسکری، مئی ۱۹۴۴ء، لاہور: سنگ میل ۲۰۰۸ء ص ۱۵۹

(۱۱) صفدر میر، مضمون'' بیابان جنوں مشمولہ نئی شاعری، لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء، ص ۱۴

(۱۲) آفتاب احمد، ڈاکٹر، اشارات، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۶ء، ص ۳۴-۳۵

(۱۳) حقانی القاسمی، مضمون ''غزل میں کفر و الحاد کا تصور''مشمولہ سہ ماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی، نئی غزل نمبر جنوری مارچ ۲۰۱۳ء، ص ۲۹۲

(۱۴) کسی شخص کے باطن یا مذہبی رجحان پر قطعی اور معروضی رائے دینا درست نہیں۔راشد کے مذہبی اعتقادات پر ڈاکٹر فخر الحق نوری نے تفصیلی بحث کی ہے۔ دیکھیے مضمون ''راشد کی شخصیت کے مذہبی رنگ''، مشمولہ مطالعۂ راشد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء

(۱۵) ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۷

(۱۶) محمد تقی عابدی، مضمون ''خدا اور اخلاقیات مشمولہ فلسفیوں کا خدا''، لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۶

(۱۷) سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اُردو شاعری کی تہذیبی و فکری بنیادیں، لاہور: الوقار، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۲۴